(غلام گردش)

پاکستان کے ابتدائی لوگ

برصغیر کی تقسیم کے موقعہ پر جو نسل موجود تھی، اس میں ہر طریق کا ہنر کمال حد تک موجود تھا۔ عجیب بات ہے۔ جتنا بھی غور کیا جائے، حیرت ہوتی ہے۔ مبالغہ اور تعصب کے بغیر سوچا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ آج سے ستر برس پہلے کے مرد، خواتین اور بچے آج کل کے لوگوں سے انتہائی مختلف تھے۔ تخلیق، محنت، اچھوتا پن اور تجربے کی مٹی میں گندھے ہوئے انسان۔ وہ لوگ جو پاکستان بننے سے پہلے موجود تھے، ہر لحاظ سے میری اور آج کے دور کی نسل سے بہتر تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں۔ اس دقیق سوال کا جواب تلاش کرنے کیلئے سالوں سے مصروف کار ہوں۔ مگر کوئی سنجیدہ جواب نہیں مل رہا۔ شائد سوال ہی غلط ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ سوال کی بنیاد مکمل طور پر صائب اور سنجیدہ ہے!

کسی میدان میں دیکھ لیجئے۔ سول سروس سے شروع کرتا ہوں۔ ابتدائی سرکاری ملازم کو پرکھیے۔ ان میں مختار مسعود، قدرت اللہ شہاب، شیخ منظور الٰہی، مسعود کھدر پوش، قاسم رضوی اور طارق صدیقی جیسے لوگ نظر آتے ہیں۔ خیر یہ تو مشہور لوگ ہیں۔ انکے علاوہ بھی بہت سے نمایاں افسر تھے۔ مگر گوشہ گمنامی میں رہے۔ اسلیے کہ شرفاء کا طریق یہی تھا۔ یہ نہیں، کہ اپنی تعریف اور منافقانہ ایمانداری کا ڈھول خود اپنے ہاتھوں سے بجاتے رہیں۔ آج کا سرکاری چلن یہی ہے۔ اس وقت ذہن میں یہی چند نام آ رہے ہیں۔ یہ سرکاری افسر تو تھے ہی، مگر ہر انسان اپنے اندر ایک جہان نو کا مالک تھا۔ سادہ، پُرخلوص اور پُرتاثیر لوگ۔ عام لوگوں کی مشکلات کو حل کرنے والے لوگ۔ نئی بات، نئی جہت اور تازہ خیالات کے مالک ان افسران میں خوبیاں انکی خامیوں سے بہت زیادہ تھیں۔ سوچیے، اگر مختار مسعود عملی طور پر محنت نہ کرتا، تو کیا مینار پاکستان جیسا عظیم نمونہ اس برق رفتاری اور کم پیسوں میں بن سکتا تھا۔ قدرت اللہ شہاب ہر بڑے سے بڑے عہدے پر رہا۔ مگر ذاتی جائیداد کیا تھی۔ سفید پوشی برقرار رکھتے رکھتے دنیا سے گزر گیا۔ شہاب نامہ لکھنے کی صلاحیت آج کس افسر میں موجود ہے۔ اب تو سرکاری ملازمین میں جعلی دانشور اور ادبی قذاق موجود ہیں، جو خود اپنی علمی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹتے تھکتے نہیں۔ سوچیے، کیا آج، ایک بھی ایسا شخص ہے جو پاکستان کے ہر بڑے عہدے پر فائز رہا ہو۔ مگر پیسے کے لحاظ سے قلاش ہو۔ آج کل تو کئی افسر، سرکاری نوکری میں آتے ہی لوٹ مار اور پیسہ کمانے کیلئے ہیں۔ خیر سرکاری بابوؤں کا ذکر چھوڑیئے۔ تقسیم ہند سے پہلے کی نسل کے سرکاری ملازمین، آج کی سرکاری پود سے بہت بہتر تھے۔ مقابلہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر سوال اپنی جگہ برقرار ہے، کہ آخر کیوں؟

شاعری کی طرف آیئے۔ دیکھیے کیسے کیسے خوبصورت نام نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض، احمد فراز، احسان دانش، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، منیر نیازی، مصطفیٰ زیدی اور جوش ملیح آبادی جیسے دیو آنکھیں چکا چوند کر دیتے ہیں۔ ہر شاعر پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ ان شاعروں کے ذہنی فلسفہ سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ یہ آپکا حق ہے۔ مگر اس قامت کے شاعر کیا آج کل موجود ہیں۔ جواب آپ بھی جانتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ تمام شعراء پاکستان کی ابتدائی نسل کے سرخیل تھے۔ یہ تمام لوگ برصغیر میں پیدا ہوئے۔ اسکے بعد پاکستانی کہلائے۔ کوہاٹ کے پٹھان گھرانے میں پیدا ہونے والا احمد فراز کا اردو سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ مگر آپ اس شخص کی شاعری

پڑھیے۔اردو زبان کو بھی فخر ہوگا کہ فراز جیسا انسان اس زبان میں شاعری کر رہا ہے۔فیض کے متعلق لکھنے والے درجنوں کی تعداد میں ہیں مگر فیض احمد فیض جیسا شعر کہنے والا ایک بھی موجود نہیں۔قطعاً یہ عرض نہیں کر رہا کہ آج کے شعراء کرام کسی لحاظ سے ادنیٰ ہیں۔مگر حقیقت یہ ہے کہ اس پایہ کے شعر کہنے والے ناپید ہیں۔باقی باتیں ہیں۔صرف باتیں۔جوش ملیح آبادی کے سامنے اردو اور فارسی الفاظ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔لفظوں کا جادوگر شخص اس ادبی برتری پر فائز تھا کہ الفاظ کو اپنی مرضی سے استعمال کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ہر لفظ موتی کی طرح کا۔مگر کہاں استعمال کرنا ہے، یہ صرف جوش صاحب ہی کا خاصہ تھا۔کیا آج ایک بھی شاعر جوش ملیح آبادی کے قد کاٹھ کا ہے۔جوش تو وہ شخص تھا جسے وزیراعظم نہرو نے ہر طرح سے ہندوستان میں رہنے کی ترغیب دی تھی۔نہرو اس عظیم شاعر کا مرید تھا۔تمام رات جوش صاحب کو سنتا تھا۔مگر یہ مردِ عجیب دنیاوی فائدے کو ٹھوکر مار کر پاکستان چلا آیا۔یہ عجیب لوگ تھے۔صاحب، بہت عجیب لوگ۔مصطفیٰ زیدی کا کلام پڑھیے۔طالبعلم حیران ہو جاتا ہے۔کیسے کیسے ہیرے جیسے شعر، کمال فن، کمال فن!

کسی اور غم میں اتنی خلش نہاں نہیں ہے
غم دل میرے رفیقو، غم رائیگاں نہیں ہے
کوئی ہم نفس نہیں ہے، کوئی راز دان نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو وہ مہربان نہیں ہے

یہ شعراء کرام کیا تھے۔یہ کیوں ایسے تھے۔یہ اتنے خوبصورت شعر کیسے کہہ ڈالتے تھے۔اسکا جواب تو شائد تلاش کیا جا سکے۔مگر آج اس طرح کے لوگ ناپید کیوں ہیں۔سمجھ اور فہم سے بالاتر ہے۔

ادیبوں کی طرف آیئے۔سعادت حسن منٹو، عبداللہ حسین، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، غلام عباس، وزیر آغا اور اسی لڑی کے دیگر ادیب اب کہاں غائب ہو چکے ہیں۔اشفاق احمد جیسا صوفی لکھاری ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔منٹو کو پڑھیے۔انسان حیران ہو جاتا ہے کہ کس قیامت کا افسانہ نگار تھا۔کیا کمال کہانیاں لکھتا تھا۔صرف اور صرف 43 برس زندگی پانے والا ادیب، کیا کیا کچھ لکھ گیا ہے۔اسکا تمام ادبی کام سات جلدوں پر محیط ہے۔خیالات کا اچھوتا پن بلکہ حقیقت اور زندگی کے عملی امتزاج کا بے مثل سنگم، کسی اور ادیب کے قلم سے روانہیں ہوا۔پڑھنے والا حیران ہو جاتا ہے کہ یہ شخص کس دور میں بیٹھ کر کتنے آگے والے دور کی باتیں لکھ رہا تھا۔منٹو کے افسانوں میں سے ہندی نام نکال دیجئے۔ویسے ایسا کرنا نہیں چاہیے۔مگر صرف اور صرف مثال کیلئے اگر ان افسانوں میں سے ہندی نام نکال کر آج کے نام ڈال دیے جائیں، تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ منٹو آج کے پاکستان کے متعلق لکھ رہا تھا۔ہر طرح سے سچی باتیں۔اسے فحش نگار کہنے والے خود بے نام ہو گئے، مگر منٹو آج بھی ادب کی دنیا کا "اپنے نمونے کا واحد مینار" ہے۔نہ اسکی نقل کی جا سکتی ہے، نہ وہ خیال اتنے سہل اور آزاد طریقے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔حیرت ہوتی ہے بلکہ جہان حیرت۔

اشفاق احمد جیسا سادہ اور دل آویز صوفیانہ باتیں کہنے اور لکھنے والا اور کوئی دوسرا نہیں ہے۔یہ بھی تقسیم ہند سے پہلے کی پود ہے۔انکی

کتابیں پڑھتے پڑھتے انسان کسی اور دنیا میں سفر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ان بڑے لوگوں کے متعلق بھرپور انداز سے ایک کالم میں کچھ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ان عظیم لوگوں کیلئے تو کتابیں درکار ہیں۔شائد سینکڑوں کتابیں۔مگر سوال وہیں کا وہیں موجود ہے۔برصغیر کی اس نسل کے بعد، پاکستان میں دوسری، تیسری اور آج کی نسل اتنی بنجر کیسے ہوگئی۔بنجر لفظ بھی اس قحط رجال کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

موسیقی کی طرف آیئے۔گلوکاروں میں بڑے غلام علی خان، مہدی حسن، غلام علی، نور جہاں، ملکہ پکھراج، فریدہ خانم، امانت علی خان جیسے گائک اب کیوں موجود نہیں ہیں۔ان جیسی ملکوتی آوازیں اب صرف اور صرف خواب کیوں بن چکی ہیں۔ان میں ہر گائک اور گائکہ اپنی مثال آپ ہے۔کسی کا کسی سے کوئی مقابلہ نہیں۔امانت علی خان کی گائی ہوئی غزلیں سنیں۔آواز میں اتنی شائستگی اور لوچ ہے، کہ ذہن حیرت میں گم سا ہو جاتا ہے۔مہدی حسن جیسی صدا بہار آواز اس درجہ خاص ہے کہ اسے نقل تک نہیں کیا جا سکتا۔جی چاہتا ہے کہ آپ اسے سنتے ہی جائیں۔سُر اور لَے پر یہ گرفت فقید المثال ہے۔مہدی حسن کی گائی ہوئی غزلوں کو آج کا کوئی بھی گلوکار ویسی پختگی سے نہیں گا سکتا، جو اسکا اصل خاصہ ہے۔نور جہاں کے متعلق کیا بات کی جائے۔اسکی آواز کی خوبصورتی کے متعلق کیا لکھا جائے۔بلکہ سوال یہ ہے کہ کیونکر لکھا جائے۔نور جہاں کی گائی ہوئی غزلیں اور گانے آج بھی اَمر ہیں۔یہی حال فریدہ خانم کا ہے۔کس کس کا ذکر کروں۔مگر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ تمام لوگ برصغیر میں تقسیم سے پہلے پیدا ہوئے۔ان میں سے ایک بھی پاکستان کا پیدائشی شہری نہیں تھا۔ایک بھی ایسا قد آور گلوکار نہیں جو 1947 کے بعد اس مٹی میں پیدا ہوا ہو، جسے ہم پاکستان کہتے ہیں۔

موسیقاروں کا بھی یہی حال ہے۔حال کا لفظ شائد صورتحال کی صحیح غمازی نہیں کرتا۔دراصل یہ ایک عجیب سا نامعلوم المیہ ہے۔خواجہ خورشید انور، غلام احمد چشتی جو بابا چشتی کے نام سے جانے جاتے تھے، فیروز نظامی اور سلیم اقبال بے مثال موسیقار تھے۔انکی ترتیب دی گئی دھنیں سدا بہار ہیں۔ان میں سے کوئی بھی ایسا موسیقار نہیں، جسکے پایہ کے لوگ آج موجود ہوں۔آج کل کے موسیقار، انہیں کی پرانی دھنوں کو نیا رنگ دیکر اپنی دکان چمکاتے ہیں۔یہ تمام لوگ بھی برصغیر کے باسی تھے۔انکے بعد ملک میں اسی سطح کے موسیقار کیوں نہیں نمایاں ہوئے یا پیدا ہوئے، یہ اپنی جگہ سنجیدہ بحث ہے۔

کسی بھی شعبہ کو پرکھیے۔آپکو حیرت انگیز یکساں مفلسی نظر آئیگی۔سیاستدانوں میں ذوالفقار علی بھٹو، نواب زادہ نصراللہ خان، مفتی محمود، جی ایم سید اور ولی خان جیسے سیاسی جن نظر آتے تھے۔اس شخصیت کے قومی سطح کے سیاستدان اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔دوبارہ گزارش کرونگا۔کسی بھی شعبہِ زندگی میں اس صلاحیت کے افراد موجود نہیں ہیں جو برصغیر کی پہلی یا ابتدائی نسل تھی۔شائد آج کل ہر سہولت موجود ہے مگر ذہنوں میں وہ روشنی نہیں رہی جو آنے والی نسلوں کیلئے مثال بن سکے۔قحط ارجال کا مطلب اب سمجھ آتا ہے۔مگر ابتدائی سوال ابھی تک موجود ہے۔ہم انسانی لحاظ سے اتنے بنجر کیوں ہو چکے ہیں؟

راؤ منظر حیات